

اور اے فرض بخت امکان سے بے نیاز ہے اور اس میں انجام کی پروا کیے بغیر بروقت لگے رہنا چاہیے۔ اتنی وضاحت بیان کیا جو اور بنیاد کلام نے پھول اس مہولی زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت کی ایسی روشن شہادتیں ہم پہنچائی ہیں کہ ایک منکر قرآن ہی اس کے انکار کی جرات کر سکتا ہے۔ ہر نبی کو منصب رسالت پر مامور کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت اور اس مطالبہ کا اعلان کر دو کہ:-

اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ

لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کے اتباع سے بچو

... اِنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِي

... میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔

چنانچہ اسی اعلان سے ہر نبی نے اپنی دعوت کی ابتدا کی۔ یہ چند حرفی اعلان و اصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی غیثیہ ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں اقامت دین کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبی نے آتے ہی اپنے اس منصب بعین کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور خود اس کے لیے عملی سعی و جہد شروع کر دی کہ خدا کی زمین پر صرف اسی کا نازل کیا ہوا ضابطہ حیات نافذ ہو اور نافرہے۔ صحابوت "الہ" اور "طاغوت" کے موجودہ بے جان تصورات کے پیش نظر اس بات کے اندر کچھ نہ پہنچا نہ غور محسوس ہو گا کہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نبی نے اقامت دین کی جہد و جہد شروع کر دی۔ لیکن قرآن نے اس و ہم کا خود ہی استیصال کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ جہالمین توراہ و انجیل و قرآن ہی کو یقیناً نہیں سپرد کیا گیا تھا بلکہ ہر نبی کا مقصد بعثت یہی تھا:-

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي

اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی (پہلی) نوح

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَ

کو وصیت کی تھی اور جس کی (اے نبی) تمہارے اوپر وحی کی ہے اور جس (کلمہ)

عِيسَىٰ أَنْ يَقُولُوا الدِّينَ (شوریٰ- ۱۳)

نے انجیل و وحی و عیسیٰ (وغیرہ تمام انبیاء امدان کے پیروں) کو علم دیا تھا اور کہا تھا

کہ اس دین کو قائم کرو۔

غرض قرآنی تصریح گواہ ہے کہ ہر نبی کو اللہ واحد کے نازل کردہ دین کی دعوت اور اقامت کا فرض سپرد کیا گیا تھا اور پھر قرآن ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ ہر نبی نے اس امر الہی کی بجا آوری اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس دعوت کے کامیاب ہونے پر خدا سے گارنٹی طلب کی نہ ایک لمحہ اس کے انجام پر فکر و تامل میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا ان کے ذہنوں نے سوال اٹھا یا، نہ حالات کی ناسازگاری ایک آن کے لیے ان سے اس آواز کو سینہ میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ ہر ایک نے اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الہی الخی نے کامیابی حاصل کی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر گئے تو جتنا ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نهار اس اداسے فرض میں صرمت کر ڈالے مگر اس طویل اور صبر آزمائی کا انجام ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" راست دن ان کو نوازتی رہتی تھی۔ اور جب ان کی ادائیگی فرض کا زمانہ ختم ہوا

توان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر تک اس عبادت اللہ اور اجتناب طاغوت کا پیغام سنایا اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے، اس کوشش اور پیغام رسانی کے دوران میں انہیں جن جن ابتلاؤں اور جانکاه مصیبتوں سے گزرنا پڑا، ان کے تصور ہی سے دل کا نپ اٹھتا ہے لیکن اس ساری تک و دو اور ان پیغم قربانیوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے اپنے اہل و عیال کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیب، ہود، صالح اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام کے سوا رخ حیات میں کم و بیش ہی قسم کے حالات و مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ پھر اسی طائفہ میں حضرت یحییٰ اور انہی کی طرح کے کچھ دوسرے انبیاء بھی موجود ہیں جن کی تبلیغ ہدایت کا انجام یہ نظر آ رہا ہے کہ کلمہ حق سننے والا تو ایک فرد بھی نہ ملا لیکن کسی کی گردن پھانسی کے پھندوں میں دیدی گئی اور کسی کے سر پر آگ چلا دیے گئے۔

وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت اس حقیقت کا سب سے بڑا شارح ہے۔ آپ کو اسی پیغام کے ساتھ جو ہر نبی کو برائے تبلیغ ملا تھا اور اقامت دین کے اسی شن کو دے کر، جس کو ہر نبی لے کر آیا تھا، مسعود فرمایا گیا، ایک طرف تو یہ پیغام بھی پہلے کی بہ نسبت کامل اور وسیع المعانی تھا، دوسری طرف مخاطب ایک مخصوص سر زمین کے بجائے پورا ربیع مسکون تھا۔ اور اس "ربیع مسکون" کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشہ میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس حال میں خدا کا یہ آخری پیام برآتا ہے اور آتے ہی وہی بات بنیہ کسی لاگ پیٹ کے اپنے لوگوں کو سناتا ہے جو ہر نبی سناتا آیا۔ یہ تدریجاً دعوت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے یہاں تک کہ پورے تین سال بھی نہ گزرنے پاتے تھے کہ اللہ کی جناب سے تبلیغ و اعلان عام کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

فَأَصْدَقَ بِمَا أُتُوهُمُ وَأَعْرَضَ عَنْ الْكُفْرَانِ (حجر)

جس بات کا ترجمہ کو حکم دیا گیا ہے اس کو دانگن کمد اور شرکوں کی بڑا کر

خدا کا نبی امتثال امر کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے اور جو بات اب تک وہ اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے گھروں کے اندر اور دیواروں کے پیچھے سنایا کرتا تھا اسے اب پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر سارے عرب و عجم کو ہانکے پکارے سنانے لگا، سننے نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو کہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک دھبوں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی، اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو یہ کہ جس کلمہ حق کی تبلیغ و تقسیم کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کے سنانے سمجھانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور جس صداقت پر ان گم کردہ راہوں کی فلاح و نجات منحصر ہے اس کو یہ سنتے اور مانتے کیوں نہیں! اس کی سادہی تنائیں اس ایک آرزو میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دونوں میں اتر جائے اور جس ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ نازل فرمایا ہے اس کو یہ لوگ قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار محبت کے ساتھ پھرکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کرتا ہے کہ تمہارا کام صرف پنچا دینا اور کھول کھول کر امر حق بیان کر دینا ہے، اگر ایک شخص بھی اس امر حق کو سن کر نہیں دیتا تو اس کی کوئی پروا نہ کرو (ذَان تَوَلَّوْا فَمَا عَلَيْنَا

الْبَلَاغُ الْمُبِينُ) یہ کالوں میں انگلیاں ٹھونس کر کچھ اپنا ہی بگاڑیں گے، تمہارا کچھ بگاڑیں گے۔ تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بے پروا ہو کر بھالائے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے

دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو۔

وَأَمَّا زَيْنَبُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ فِتْنًا فَجِدْنِي
فَالْيَوْمَ حَسْبُكُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدًا عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ (پوس)

اور اے پنیر! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھلا دیں گے (اور تمہاری نگاہوں کے سامنے جائے اپنے انجام برے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا تم کو وفات دے دیں گے۔ سو ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے، پھر یقین رکھیں کہ ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

بشت محمدی پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجئے۔ پنیر صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہدایت کے بعد ساری دنیا کا بالعموم اور قوم عرب کا بالخصوص، دو میں سے ایک نتیجہ ہونے والا تھا۔ یا تو وہ اس پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں سے سرفراز ہو یا انکار کر کے ہمیشہ کی لعنت اور دائمی عذاب خرید لے۔ ایک سمونی انسان بھی اپنی قوم کو اس طرح نذر ہلاکت ہوتا دیکھتا گوہارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ انسان جو محبت و رافت کا سیکر اور رحمت لعلین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکثر ناقابل اعتدال انڈیشوں نے اس حق کی تکذیب اور مخالفت کر کے ہلاکت کی راہ چلنی چاہی تو آپ کا دل خون ہونے لگا، اس فکر میں کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پہ آجائیں، زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت قلق اور اضطراب میں گذرتا تھا، رات کی رات اس الماح و زاری میں بسر ہو جاتی تھی کہ خدایا! اس قوم کو ہدایت دے، اس کے دلوں کی آنکھیں کھول دے کہ وہ تیرے غضب سے بچ جائیں۔ یہ جوش رافت اور جذبہ خیر سگالی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ حالت شرک میں مرجانے والوں کے حق میں بھی دعائے استغفار کرنے سے آپ باز رہ سکتے اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ اہل فیصلہ ستار دیا کہ "ان کے لیے دعائے مغفرت ذکر وہ، اگر تم ایک بار نہیں ستر بار استغفار کرو تو بھی میں ان کو بخشے گا نہیں" رحمت عالم کی زبان پکار اٹھی "خدایا! میں ان کے لیے ستر بار سے بھی زیادہ استغفار کروں گا۔" آپ بڑھکر اس امر واقعہ کا کون ادراک رکھتا تھا کہ یہ قوم اس خطرناک آزمائش میں صرف میری بشت کی وجہ سے ڈالی گئی ہے جس کا اگر ایک پہلو روح پرور ہے تو ساتھ ہی دوسرا پہلو جاگندہ بھی ہے۔ اگر ایک طرف خلافت اٹھی کی سرفرازیوں اور فردوس بریں کی بہاریں ہیں تو دوسری طرف غضب الہی کی ہلاکت خیزیوں اور عذاب جہنم کی الم ناکیاں بھی ہیں اور قوم ہے کہ اسی دوسرے پہلو کو اختیار کرتی اور اسی دوسری طرف جانے پراہرا کر رہی ہے۔ لیکن پنیر عالم یہ سارا رہشت ناک ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کو مجبور محض پاتا رہا تھا اور قوم کے درد میں تڑپنے لگے باوصف اس صورت حال میں کسی ادنیٰ تغیر کی بھی مجال اور گنجائش نہ دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ میری ہی دعوت کلا الہ الا اللہ کا اثر ہے کہ شاید یہ قوم عاود نمود کی طرح پیوند خاک کر دی جائے، لیکن ہے یہود کی طرح ابدی لعنت میں مبتلا ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ جنگ و جدال کی توبت آئے، بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے، باپ بیٹے کے خون کا پیا سا ہو جائے، یعنی رشتے کٹ جائیں، خانہ ان تباہ ہو جائیں، وطن تاراج ہو جائے۔ لیکن ارادے فزع کی ناگزیری کا کیا علاج! سینہ بھینچتا ہے تو بھینچے، دل فکرت و حسرت کے بھوم سے مضطرب ہے تو مضطرب رہے، کندھے اس بارگراں کے دباؤ سے شل ہوتے ہیں تو ہو جائیں، اور کراس بوجھ سے دو نیم ہو رہی ہے تو ہو جائے، مگر یہ کوئی اپنی سوچی ہوئی اسکیم تو نہیں ہے کہ ملتوی یا ترک کی جاسکے، یہ تو بیچنے والے کا متور کیا ہوا فریضہ زندگی ہے جس کو ہر حال میں پورا ہونا چاہیے۔ پنیر کے دل کے یہی سارے جذبات

ہیں جو ان آیات کے اندر جھلک رہے ہیں۔

قُلْ مَا يَكُونُ فِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي إِنَّ
اتَّبِعُوا أَلَامًا يُؤْمِلُونَ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُمْ رَبِّي عَذَابًا
يَوْمَ عَظِيمٍ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ
بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ
(یونس - ۲)

اسے سپنیر: ان لوگوں کو کہہ دیجئے اسے باکازرا استحقاق نہیں کہ بطور خود
اس قرآن میں کوئی رد و بدل کیوں۔ میں یونس اسی چیز کا تابع ہوں جو مجھ
وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھ کو ایک بڑے
دن کی سزا کا ڈر ہے، اور کہو، اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ قرآن تمہیں پر
سناتا ہی نہ اور نہ وہ تم کو اس کی اطلاع دیتا، چنانچہ اس سے پہلے میں

تمہارے اندر ہی ایک گزرا چکا ہوں (اس وقت تو میں نے کوئی چیز تمہارے سامنے نہیں پیش کی تھی کہ اب یہ قرآن اپنے جی سے بنا کر تم کو سناتے لگا)
کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

لوگوں کا — "حالات زمانہ سے واقف" اور "صلحت شناس" لوگوں کا — مطالبہ یہ تھا کہ جس قرآن کو آپ پیش کر رہے
ہیں اس کی تعلیمات ہماری قومی نفسیات سے میل نہیں کھاتیں نہ احوال و ظروف حاضرہ سے سازگاری رکھتیں، اس لیے اس
کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائے جس میں یہ خامیاں نہ ہوں، یا اسی قرآن میں کچھ اس طرح کی ترمیم و اصلاح کر دیجئے کہ اس میں
میں ٹھیک فٹ ہو سکے (ایٹت بقراءت اوبدلتہ - یونس ۲) ورنہ اگر آپ نے من و عن اسی قرآن اور اس کی تعلیمات کی
تعلیم و ترویج پر اصرار کیا تو یاد رکھیے ایک فتنہ اٹھے گا اور قومی عمارت کے ایک ایک گوشہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ سپنیر یہ خطرہ
خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ خطرہ بھی جو آنے والی زندگی سے متعلق تھا، ان دور مینوں کی تذکیر کا محتاج نہ تھا، مگر ساری
بات کی ایک بات یہ تھی کہ آخر وہ کرتا تو کیا کرتا سو اس کے کہ حسرت و اندوہ بھرے لہجے میں ان کو یہ سنارے کہ مَا يَكُونُ فِي
أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي إِلَّا

یہ انبیاء کے ان احوال و سیر کے چند مشہور و مستند حقائق اور واقعات ہیں، جو سوچے بوجھ رکھنے والوں کی عبرت پذیری
اور حق نمائی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات میں جو اصول حق سب سے زیادہ نمایاں اور جو نقش
حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں
نہ حالات کی سازگاری کا کوئی اندازہ لگانے یا کامیابی کے امکانات ٹوٹنے کی گنجائش ہے۔ جو چیز ہمارا فریضہ زندگی قرار
پا چکی، وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض، فرض نہیں
جس کو مشکلات کے اندیشے منسوخ کر دیں، جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھاسکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت
دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا ٹوٹنا ممکن ہوتا تو یقیناً جلنے والی انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا اظہار رکھ کر
اس کے لیے سعی و کوشش تو درکنار۔ کیونکہ عموماً ہر نبی توحید کی دعوت اور اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں بھیجا ہی اس وقت
جاتا تھا جب حالات کی سازگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، جب کلمہ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا تھا، جب
صدائے توحید بلند ہوتے ہی ہر طرف سے کنگر تھیر رہنے لگتے تھے۔ لیکن حالات کی اس شدید نامساعدت، مشکلات و موانع
کی اتنی زبردست مزاحمت اور امکان کامیابی کی اس انتہائی قلت کے باوجود، جس سے ہم اپنے موجودہ حالات کا کوئی

مقابلہ نہیں کر سکتے، انہوں نے کشتی بحر ظلمات میں ڈال دی اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پر سکون ہے یا طوفانی؟ بادبان ٹھیک ہے یا نہیں؟ ہوا کا رخ کیا ہے؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں تو نامانی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کن رہے یا ناپید کن رہے؟ راستہ صاف یا بازیر آب پناہیں ہیں؟ انہوں نے ان میں سے کسی بات پر بھی تامل نہ کیا۔

مشکلات راہ اس فرض کی اہمیت | اب اگر ہم نے انبیاء کے قصص و احوال کو مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاریہین کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو زمانہ قدیم کی ایسی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں کم نہیں زیادہ کرتی ہیں۔

جن کی ہم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے۔ سو اس کے کہ آیات قرآنی سمجھ کر کھن حصول ثواب کے لیے ان کی تلاوت کر لینی چاہیے تب تو بات ہی اور ہے لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بد بختیوں نے ابھی تک ہم کو نشوونما اللہ فَأَشْهَدُ أَنْفُسَهُمْ کی حد تک نہیں پہنچا ہے بلکہ ہم ان قصص کو اسی طرح مشعل ہدایت اور منبع اعتبار و بصیرت یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن نے ہم کو بتایا ہے تو ہم انبیاء کی اس مقدس تاریخ کے ہر دور اور ہر ورق پیلے ایک غیر متغیر اصول سیکھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہمارے پروردگار نے ہمارا مقصد زندگی ٹھہرا دیا ہے اس کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے۔ ہر عمر یہی کہہ جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے اور اس کے لیے مشکلات راہ اور ناسازگاری ماحول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ دیکھتے ہو کہ ہر نبی بالعموم ایسے وقت میں اس کام پر متعین کیا جاتا ہے جب کہ حق و ایمان کی روشنی اس زمین سے بالکل مفقود ہو چکی تھی اور کفر و مادیت کی آفاق گیر تاریکی میں اس جدوجہد کے لیے امکان کامیابی کی کوئی کرن دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی تھی، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے مانوس ہے اور جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ ہوں، وہ ہریت و مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو اور طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم ہو۔ علمبرداران حق پر اقامت دین انہی کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر حالات کا یہ صحیح اندازہ ہے کہ دنیا حق سے اتنی ہی پرستہ اور متنفر ہو چکی ہے کہ اس کو دین حق کا نام بھی سننا گوارا نہیں تو یہ اقامت دین کی جدوجہد میں کسی تعطل یا تخفیف کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں انتہائی سرگرمی، جوش اور انہماک کا طالب ہے۔

فریضہ زندگی کا مقام اہل کفر | زندگی کا یہ اصل الاصول کہ نصب العین کی فطرت ہی ہے کہ وہ امکان و عدم امکان کی بجٹوں کا تحمل نہیں ہو سکتا، ایسا مستحکم اور عالم گیر ہے کہ نہ صرف اسلام ہی نے اس کی نگاہوں میں

کا اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے اور نہ صرف انبیاء اور ان کے سچے متبعین ہی نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، بلکہ کافرین اور خالص دہریوں تک کے یہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور وہ بھی فریضہ زندگی کا مقام ہی سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کی سازگار اور ناسازگار یوں سے بے نیاز اور بہر صورت زندگی کے آخری سانس تک ایک سہی سہیم کا مستحق ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد پائے جاسکتے ہیں۔

مارکس کے پیرواس کے چند مخصوص نظریات زندگی پر ایمان لائے اور انہی نظریات کی "اقامت" میں انہوں نے مصائب انسانی کا علاج یقین کیا، اس لیے یہی چیز ان کی زندگیوں کا نصب العین قرار پا گئی اور انہوں نے اس کی ترویج عام کے لیے پوری قوت سے جہاد شروع کر دیا، یہ جہاد اس ملک میں شروع کیا گیا جس پر دنیا کی سب سے مستبد حکومت مصلحتی

سے اپنے بچے گاڑے ہوئے تھی اور جہاں زار کی مطلق العنانیت اور تمامیت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا، مگر اشتراکی
 اہم نوں پر معاشرہ اور حکومت کی تنظیم کو اپنا فریضہ زندگی قرار دینے والوں نے ان مصائب و آلام کی طرف سے آنکھیں بند
 کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپے انھیں گھور رہے تھے۔ جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ
 تعذیب و تیریب کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشتا کی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا
 جو موت کے جنگل سے بچے ان کو سا بئیریا کے برساتی جہنم میں بھونک دیا، ظلم اور زیادہی کی کوئی ایسی ممکن صورت نہ تھی
 جن سے ان کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک یہی ہنگامہ دار زگر بر پارہا مگر کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے پایہ عزیمت
 میں لغزش نہ پیدا کر سکا اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے نیچے دھارے سے ان کو تیراتا اور منزل مقصود کی
 طرف ان کے قدم بڑھاتا رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر، جبکہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے،
 باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ
 اشتراکی نظام سلطنت کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا، اس کی اس پالیسی سے
 جو دراصل اصول اشتراکیت سے صریح تجاوز اور ان کے ساتھ کھلی ہوئی غداری اور منافقت تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف
 کیا اور اشتراکیت کی اصلی روح کے قیام اور خالص مارکسیت کی بقا پر زور دیا، اسٹالن نے نہ صرف اس کی بات ماننے
 سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں مجلس حل و عقد نکال باہر کیا، خفیہ پولیس نے اس کے اور اس کے حواریوں
 کے منہ بند اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے، مگر وہ جن اصولوں کا عقیدت کیش تھا اور جن کے قیام و بقا میں اس کو خلائی کی فلاح
 نظر آ رہی تھی، ان کی تبلیغ سے باز نہ رہا، آخر کا جلا وطن کر دیا گیا، امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے اصولوں کی اشاعت کرنے لگا اور اپنے
 نصب العین کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے دشمنوں کے دشمنوں میں بھی پہنچے اور ایک روز خفیہ سازشوں کے ذریعہ
 اس کے سامنے موت کا پیلاہ پتی کر دیا اور مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس پیلاہ کو قبول
 یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں، اذرا قریب آئیے، یہ جا پانی اور جرمن قومیں جو زعموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں، ان کے
 رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا، وہ اس پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل
 ہو گئیں، جرمنوں نے آگے رکھا، انھوں نے نوک شمشیر اس روک کو دور کرنے کی ٹھان لی، میدان کارزار گرم ہو گیا، بحیثیت
 و اتفاق نے جو پانسہ پٹا تو جیتی ہوئی قومیں بچنے بٹنے لگیں، منگولوں اور تباہیوں کے طوفان گھیر لیا، مگر اپنے مطلق جذبہ طاقت
 اور مطمح نظر کا عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود پڑتے، ہوائی جہازوں سے چھلانگ
 لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چینیوں میں جا گھستے، بموں سے لدا ہوا پورا جہاز ان بحری جہازوں پر جا گرتے
 اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خود کش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش طیارے" کے تحریر الفاظ کا اضافہ کر گئے۔ اور اب
 قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں ناکام بنا دیا ہے، وہ اس عقیدے کے ساتھ ہر اکری کر رہے ہیں کہ مرنے کے بعد دیر تباہ کر
 اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش یہ کہہ کر شروع کرتی

ہیں کہ یہ بڑے ہر کر اپنے دشمنوں اور عظمت قومی کے غارت گروں سے انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، جن کی قربانیوں کا انجام اپنی زندگی کے لیے خود ان کے اپنے عقائد کے مطابق معدوم محض ہے اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے دلوں کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے کوئی درس عبرت ہے؟ کیا رضائے الہی اور سعادت ابدی کے حصول میں اتنی گہرائی بھی نہیں جتنی ان حیوانی مقاصد کے حصول میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی حرارت بھی نہیں جتنی مومنین بالطاعت کے دلوں میں دکھی جا رہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی حمیت بھی نہیں دکھائی جاسکتی جتنی باطل کی شہادت میں آج ظاہر ہو رہی ہے؟ اور کیا فرض زندگی کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دیتے کو تیار نہیں جتنی یہ کفار و کفاروں سے رہے ہیں؟ انبیاء کرام کے واقعات کو نفس جلیگرہ ہمبراز جوش تبلیغ اور معجزہ اور تائید روح القدس کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتے ہیں مگر اہل کفر و ضلال کی ان سر فرود شاخ مساجی کے پیچھے کس معجزہ کا سراغ بتایا جائے گا۔ کاش ہم امکان و عدم امکان کی بحثیں شروع کرتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انہیں سے مستعد زندگی کا مفہوم سیکھ لیتے۔ افسوس بکہ یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے، وہ جن کی نظر اسی عالم آب و گل تک ہے، ادائے فرض میں فخر انجام سے اتنے بے نیاز ہیں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ "ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت صرف اللہ کے لیے ہے" اور "ہم اللہ کی پرستش میں مصروف ہیں۔ جو فتنہ حقیقت ایک اندھا کا فرضی ہاتھوں سے ٹوٹل کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو بھائی نہیں دیتا۔

پہ عقیدت ہے، جذبات پرستی نہیں | اگر یہ بات اپنی جگہ تنگ سے بالاتر ہے کہ ادائے فرض کے سلسلہ میں امکان کی بحث نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایمان القرآن کا مزاج لطیف اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ صرف یہ کہ ہر طرز فکر غیر اسلامی ہے بلکہ کوئی غیور اور باہمت کفر بھی ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند، مانعوں میں اتر نہیں سکتی۔ عقل و تدبر کے دعوے دار ایک طعن آمیز بستم کے ساتھ بول اٹھیں گے کہ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے فکر و عمل سے کوئی تعلق نہیں" "اہل دانش" کے اس رپارک کو ہم بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ بول کر بیٹھتے، کیونکہ اسٹارٹر اور دمداری اٹھانے اور اتنی پر خطر راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گہری پڑھانی ہے۔ پھر یہ عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے۔ پکار کر کہتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور تصریح کے ساتھ اس جذباتی اصول کی تسلیم دیتا ہو۔ اگر ایک شخص اس دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ وہ کچھ بوجے الاڑے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی ہمت نہ کرے، اگر اس کے دین کے اس سے مطالبہ ہو۔ لیکن اگر اس کی تعلیمات اور اصول اس کی نگاہ میں جذباتی یعنی ناقابل عمل اور غیر معمولی معلوم ہوتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی صدا کا قائل ہی نہیں ہو رہا اس پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس کا ایمان اپنی عقل و فہم پر ہے اور ایمانزداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے ہر عمل و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تیقن اور تعین کر لے۔

لیکن کیا واقعہ یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس اصول کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کا ہماری عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں؟ ہر بالغ نظر انسان سمجھتا ہے کہ خود و فکر کے بعد اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر اور رہنمائی سے ان دونوں میں سے کسی چیز کو بھی بے دخل نہیں کیا جاسکتا، یہ البتہ ہے کہ دونوں کے مخصوص اور حتمی حدود و اثر و عمل میں اور ایک کو دوسرے کے حلقہ کار میں لے جانے کا مطلب اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا ہے۔ کسی مقصد کی تعین تو خالص عقل ہی کرتی ہے اور وہ شخص بڑا ہی احمق ہو گا جو اپنے مقاصد کی تعین میں جذبات کو بھی رائے دہی کا مستحق گردانے کو حسب عقل ایک شے کو گہرے سوچ بچار کے بعد مقصد زندگی ٹھیرا دے تو پھر آئے عقل شخص کے بس کا یہ کام نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف مطلوبہ رفتار سے قدموں کو بڑھا سکے اس وقت وہ جذبات کی دست نگر ہوتی ہے اور یہی جذبات دونوں میں وہ آتش قوت عمل اور قدموں میں وہ جوش حرکت و اقدام پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے، یہ جذبات نہ ہوں تو قوت عمل مست خواب رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا مقصد بھی ان کو سمجھو کر بیدار نہیں کر سکتا۔ عقل صرف سمت سفر مقرر کرتی اور انجن اور پیری تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود کی طرف دوڑانے والی اسٹیم ہی جذبات ہی مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اپنا یہ حق تقاضا بطور پرمیٹ حاصل کیا ہے بلکہ عقل ہی کا عطا کردہ اور تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جس طرح مقاصد کی تعین میں جذبات سے کام لینا عقلیت ہے اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہے، جذباتیت نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کو دین حق مان لینا اور اس کے بعد اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں بیت و عمل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے، عقل کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہی نیز احساس کمتری اور ذہنی، بے غیرتی اور ضعف عزم و ایمان کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

اسلام اور اقامت دین کا تلامذہم | اس تقریر سے، جو اوپر گزری، صرف اتنا ہی نہیں ثابت ہوتا کہ اقامت دین کی جدوجہد، امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر حالات کے انداز سے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا دیں، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں میں نوشتہ انہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس "سعی" میں جو اس کے نزدیک لاحاصل ہے، لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کر دینا جائز اور ممکن ہو سکے۔ مسلمانوں کے سر پر یہ کوئی اور پر سے چسکی ہوئی چیز ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اور پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں، انسان ان کو اپنے گرد و پیش زندہ اور کار فرما دیکھے اور اس کے لیے ہر دم کوشاں رہے اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے تیغ بکت نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصاحبت ممکن نہیں۔ پس یہ جدوجہد اسلام

سے علیحدہ اور اس پر مذاکرہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔ اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھیے کہ کسی انسان کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ہو تو وہ ہوس مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی اور عملی جہد و جہد سے اس کے دست و بازو نا آشنا ہوں۔ اس تڑپ اور جہد و جہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یعنی سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قہر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر نیچے سے غائب ہو جائے تو پھر اس قہر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق جنہوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو تو ہم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود ہو مگر ہوم کے سوا کچھ نہیں، لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ - اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے نتیجے میں اقامت دین کی جہد و جہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع | بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کہتے ہیں "ذکی اعس" لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن دراصل یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے کامیابی اور ناکامی کا مفہوم ہی الٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں معلوم کہ فریضہ اقامت دین کے معنی کیا ہیں، اگر یہ ذہنیت تبدیل کرنی جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ مہنگا اور عدم امکان کا سوال پیدا ہوگا۔

ہماری اصل ذمہ داری | جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الہی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی وہ دین کو قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کرنے کی امکانی جہد و جہد کرنا ہے۔ اسی طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لا زماً ایک خالص اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت اور سعی و جہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِكْرَافًا وَلَا سَوْءًا - اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھ کر اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے، چنانچہ فرمایا:-

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک تمہارے بس میں ہے۔

اِنْفِقُوا لِلّٰهِ مَا اسْتَطَعْتُمْ (قابن - ۲)

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعداء دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لیے تیار رہیں مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت فراہم کریں بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:-

اِيْحِدًا وَاِلٰهًا مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (انفال-۸)

دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قوت تیار کر رکھو جتنی تم کر سکتے ہو

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری حدود استطاعت سے محدود ہے۔ پھر دین کے معاملہ میں بھی حالات زمانہ شکلات ماہر ناسازگاری ماحول، قلت ذرائع، ان سب چیزوں کا لاؤنس انسان کو ملے گا اور ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روئے صرف اسی حد تک جو ابدی کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جہد و جد کرنے کی طاقت میسر ہے، اگر ایک شخص کو سامان کار اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جہد و جد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا مجرم قرار پائے گا خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو، بخلاف اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سر و سامان کار کے ناپید اور حالات کے ناموافق ہونے کے باعث آخر تک منزل مقصود کی طرف نہ کیے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی ہم کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ فرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے اپنی جہد و جد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھئے۔ نماز انسان پر فرض ہے اس میں قیام و رکوع و سجود بھی فرض ہیں۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی اور اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکے کے بعد ہی اس کی مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہ ہوگی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوال غلظت اور قدرت قیام کا احساس ہو فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل یہی حال اقامت دین کی جہد و جد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اپنی قوت صرف کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم میں اس کی جگہ ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بافضل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری نایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں ہر صورت پہنچ جانا واجب نہیں قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

ناکامی ناممکن ہے | جب اقامت دین کی فرضیت کا درمیا ہے تو یہ کتنا کتنی بڑی نادانی ہے کہ چونکہ بحالت موجودہ کامی کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم اس جہد و جد کو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنے کی جدی تک ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا سوال ہے۔ دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں میں کامرانی اور ناکامی دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جہد و جد ایسی ہے جس میں ناکامی کا کوئی امکان نہیں تو یہی اقامت دین کی جہد ہے جس میں بدقسمتی سے ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے حالانکہ اس راہ میں اگر کوئی ناکامی ہے تو صرف یہی کہ اپنی قوت

کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمہ حق کی سر بلندی میں سعی رکھی جائے۔ اس کے علاوہ کسی ناکامی کا خدشہ نہیں۔ اس راہ کے چلن تمام راہوں سے نیارے ہیں اور معیار کامرانی تمام معیاروں سے جدا ہے۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہر حال فتح مندی و کامرانی ہے، البتہ وہ نامرادی کے تو نام سے بھی اس کی جہد و جہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور | اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر چہار سو چھاپا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے آج مسلمان کسی چیز کے رد و قبول میں اسی عالم کے منافع و مضار کو سامنے رکھتا ہے اسی لیے اس سعی و کوشش کو لامعاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہو اور دکھائی نہ دے۔ لیکن قرآن نجات اور سعادت کا نشان بالکل مخالف سمت میں بتاتا ہے۔ وہ مسلمان کی امتیازی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہے۔ نیز وہ انسان کی کامیابی پر قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو راہ حق اور تلاشِ رضائے الہی میں لگا دے۔ اب اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا لڑے تو بھی، بہر حال میں کامیاب ہے۔ منافقوں کی تنابھی تھی اور توقع بھی کہ اب یہ جہد و م کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے ان سخی بھر مسلمانوں کو جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں، اپنی لیٹ میں لے لے گا اور ان کی یہ ساری شان و شوکت ناکامی و نامرادی کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ :-

قُلْ هَلْ تَرَبَّعُوا لِنَبَأِ الْاِحْدَى الْاِحْسَنِیْنَ
ان منافقوں سے کہہ دو کہ تم ہلکے حق میں جس بات کا انتظار کرتے

(توبہ - ۷)

دیکھا آپ نے کہ جس طرح مسلمانوں کی فتح بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی شکست کو بھی "احدی الاحسنین" کہہ کر اسی کے برابر کامیابی قرار دے رہا ہے، فتح بھی "حسنى" ہے اور شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو بہر صورت تنہا کامرانی لے کر ہی لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے اور حق کا بول بالا کرنے لگے مگر اس کے برعکس اگر وہ اس کے تمام ساتھی مارا جانے جنگ میں قتل ہو جائیں تو جہاں تک ادائے فرض کا تعلق ہے، یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے، قابلِ شکر کامیابی، ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں اور تمام مفادات قربان ہو جائیں، جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی زندگی کے صرت ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جز سے کل کی طرف آئیے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی ساری مساعی حیات یعنی مساعی اقامت دین پر پھیلا دیجیے پھر معلوم ہو گا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو دعوت حق دینے کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق قائم کر کے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جسوں نے ایک وسیع خطہ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس راز کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے عقل مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

قیام دین کے روشن امکانات | لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے بھی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اور اگر اس کو اس کے مزاج کے موافق طریقوں پر پوری سرگرمی سے جاری رکھا گیا جس کی توضیح ہم آگے چل کر کریں گے، تو اس کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح شب تار کے بعد آفتاب عالم تاب کا طلوع۔ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے آپ کو عام انسانی فطرت، دنیا کے تمدنی وسائل، تہذیب حاضرہ کے پیدا کیے ہوئے حل طلب معاملات اور حق کی ساحراۓ قوت اثر و نفوذ پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہیے، اور سب سے اول اور آخر اس چیز پر کہ مسؤل و مخاطب کون لوگ ہیں؟ عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر یہ ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ اس کا مطالبہ کسی گہری پڑھی جماعت اور بے اصول، خود غرض، دنی الاخلاق اور پست نظر لوگوں سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور مومن کی جو ضروری صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے سوا کسی کو معبود و مستعان اؤ صاحب حکم و امر نہیں سمجھتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے سوا کسی قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے، وہ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجالانے والے ہوتے ہیں، حق کے شاہد سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل و قسط کے علمبردار، باطل کے فطری دشمن، منکر کے دائمی محارب، جھوٹ سے متنفر، ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹانا ان کا شیوہ ہے، عدل پر قائم رہنا ان کا شعار ہے اگرچہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو، دشمن کے ساتھ بھی رحم و انصاف کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ کھٹے ہی مطالبہ ان کے ہاتھوں چھیل چکے ہوں، ہر حال میں راہ راست پر قائم رہنے والے ہیں اگرچہ تمام دنیا ہاتھ ٹوٹتی جاتی ہو۔ پھر دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے اور دوسروں کے مال اور جان کو حرمت کعبہ کا سختی سمجھنے والے ہیں، جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں، ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو گزند نہیں پہنچتا، خود ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں، یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے ان کے دامن پناہ گاہ ہیں اور ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی محبت مان کی عداوت سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔

کم و بیش اسی قسم کے اوصاف کے حامل مومن کہلاتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جب اقامت دین کے امکانات پر غور و فکر کیا جائے تو اس گردہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، اس چیز کو نظر انداز کر کے کبھی صحیح نقطہ نظر نہیں اختیار کیا جاسکتا۔ اس دور میں بھی جب ایمان و دیانت کا شدید ترین قحط ہے، ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں اگرچہ کیا ب ضرور ہیں، اس لیے جہاں تک لوگوں کے وجود کا تعلق ہے ہم اطمینان رکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری چیز جو قابل توجہ ہے وہ انسان کی فطرت اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ باعتبار فطرت

انسان خیر پسند ہے اور ایک تلیل قدم اور کھوپڑی ساری نوع انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، خالص باطن پرست اور شریک پسند لوگ دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں، البتہ جب ہی گنتی کے شیاطین انسانی مشینری پر قابض ہو جائیں اور پھر اہل دنیا کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے تو عام لوگ ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے بدی کی نجاستوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو فطرت انسانی کا فیصلہ ہی ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے گی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس چیز کو اس کے اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ دیکھنے کے باوجود رد کر دے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے پتلا ہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی عقل اپنی جنگی کو بیخ کنی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنے دلوں کے دروازے ہر صدائے نامانوس کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ و اشاعت حق کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوتے، مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں، انسان ٹکلی عقائد کی اندھی بروہی سے باغی ہو کر اور اودھم پرستی سے متنفر ہو کر روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے، عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور دیکھ سکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب اور حریت فکر درائے نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات سے دوچار کر دیا، وہاں ایک ایسی چیز بھی پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسے دین کو آئندہ چل کر عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اودھم کی بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے، ان اودھم کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ رہیں جن کی تعمیر ان اودھم پر ہوئی تھی، اور جو صرف ضد باقی عصبیتوں کے حصار میں ہی جی سکتے تھے۔ یہ ایک انقلاب تھا، انقلاب کی فطرت ہمیشہ بحرانی ہوتی ہے، اس لیے یہ انقلاب بھی اپنے جوش میں اودھم کے ساتھ بہت سے حقائق کو بھی ہالے گیا۔ اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطرت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ مگر اس بے اعتدالی کے تلخ نتائج اب اس کے علمبرداروں کے سامنے آچکے ہیں، اور وہ اعتدال کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس انقلاب نے ذہنیوں میں جو بوجھ پیدا کر دیا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں ڈھیلی کر کے بڑی حد تک قبول حق کی راہ صاف کر دی ہے اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایسی بات کے تسلیم کرنے میں اپنے روایتی معتقدات کو ذرا بھی مانع نہیں سمجھتے جس کی حقیقت ان کے دلوں کو اپیل کر سکے۔ عقل و ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ تاریخی حقائق بھی کچھ کم قابل اعتنائیں ہیں، جبے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے اصولوں پر نظام زندگی کو چلایا ہے اس وقت سے برابر بنی نوع انسان اپنی خود سری کے برے نتائج بھگتی چلی آ رہی ہے اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں، دصرت ناکام ثابت ہو چکے ہیں بلکہ ان کی پیدائی ہوئی چھپیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت جمع اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی طلبگار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

جب حالات یہ ہیں تو ڈرنے بھسنے اور مایوس ہونے کے بجائے ان لوگوں کو نہایت خوش دلی اور تپاک سے ان کا خرفتنگ
 کرنا چاہیے۔ چونی اوراق اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ حق صرف اسلام کے پاس ہے، عقل انسانی کو مطمئن کرنے اور مسائل
 زندگی کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کی صلاحیت صرف تعلیمات قرآن میں ہے، اس درد کا درماں صرف دین فطرت میں ہے
 جس سے آج سارا عالم انسانی تڑپ رہا ہے اور وہ اب زلال صرف سرچشمہ محمدی میں ہے جو دنیا کی تلخ گامی کو دور اور
 اس کے پیاسے جگر کو سیراب کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو محض موردی عقیدت کی وجہ سے مان رکھا ہے ان کے
 متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر اسی طرح "داؤ" دے کر خاموش ہو رہیں گے جس طرح کسی اچھے اور خوش کلام شاہ
 کو اس کے معتقدین دیا کرتے ہیں، ایسے لوگ دین حق کے قیام سے مایوس ہی ہیں اور رہیں گے اور خدا کا دین بھی ان سے
 مایوس ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کے ان اوصاف و حقائق پر اپنی عقل اور بصیرت کے
 ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان کو جان لینا چاہیے کہ ان حالات میں اگر قرآن کے سیروں
 اور اللہ تعالیٰ سے حق کی شہادت دینے کا عہد و پیمانہ کرنے والے مومنوں نے جن کی تعداد بفضل الہی مایوس نہیں ہے اپنے فرض
 کو ٹھیک ٹھیک پہچان لیا اور خلق کے سامنے حق کی اس طرح تمیز کی جیسی کہ کرنی چاہیے یعنی اگر انھوں نے اسلام کے اصول و تقاضا
 کو جدید طرز استدلال اور سائنٹفک دلائل سے مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور قوانین الہی کو زمانہ حال کی تعبیروں میں
 ڈھال کر اور مسائل حاضرہ پر ان کو منطبق کر کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ انسانی ضروریات کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی
 صرف الہی - قوانین کر سکتے ہیں۔ پھر اگر انھوں نے اس کے ساتھ شہادت حق کا عملی نمونہ اس طرح پیش کیا کہ مشکل سے
 مشکل حالات میں بھی اسلام کی راہ راست سے ان کا قدم نہ ہٹا، اگر انھوں نے عبادات اسلامی کو بجا لاکر اپنی سیرتوں
 کی تعمیر کرنی، اگر وہ انفرادی مسائل اور اجتماعی معاملات دونوں میں اسلامی اخلاق پر پوری استقامت کے ساتھ جھ
 رہا، اگر انھوں نے قومی، وطنی، نسلی، خانہ دانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے صرف اسلام کے مفاد
 کو اپنے سامنے رکھا، اگر انھوں نے ظلم کا جواب عدل سے، تعدی کا جواب قسط سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب
 سچ سے، کمروزیب کا جواب وفائے عہد اور حسن معاملت سے، اور انتقام کا جواب رحم و لطف سے دیا، اگر انھوں
 نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی سعی و جہد کا محرک صرف ان اصولوں کی تبلیغ و اقامت ہے جن میں ان کے نزدیک
 ساری نوع انسانی کی فلاح ہے اور اگر انھوں نے اس سعی و جہد میں حسب ضرورت عیش و آرام کو خیر باد کہنے اور اپنی
 آرزوں کو پامال کرنے، تہا سیاں اور بربادیاں خریدنے اور نقد جان و مال کی قربانیاں دینے میں اتنی ہی استقامت دکھائی
 جتنی کیونستوں نے کیونزم کی اقامت میں، جرموں نے نازیٹ کی حمایت و سر بلندی میں اور جاپانیوں نے میکا ڈو کی رضا جوئی
 میں دکھائی ہے تو حق کی ساحراہ قوت شجر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ یہ جہد و جہد کامیاب ہو کر ہے
 گی اور دنیا اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے از خود پیش کر دے گی، دل اس کی طرف کھینچ آئیں گے، ذہنوں کے تصورات کا نور
 ہو جائیں گے۔ اور انھیں اس کی طرف فرما عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا از سر نو پیدا خلون فی دین اللہ احواجاً
 کے روح پرور مناظر دکھائے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی پوری زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے

ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے، قدرت نے زمین کو حق کا مسکن بنایا ہے، جب حق اپنے علمبرداروں کی فرض ناشناسیوں کی وجہ سے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو دلہا باطل اس خزانہ خانی پر مسلط ہو جاتا ہے مگر جب بھی اس گھر کا اصلی مالک اپنی جگہ لینا چاہتا ہے تو قدرت کے مخفی ہاتھ اس غاصب کو نکال باہر کرتے ہیں، یہ ایک اصول ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں میں سے ایک سنت ہے جن میں کبھی کوئی تمیز نہیں ہوتا، چنانچہ فرمایا:۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اصل یہ ہے کہ باطل مٹنے ہی چاہیے

(بنی اسرائیل - ۹)

ہے۔

پس باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے، جب حق آئے گا، آئے گا نہیں بلکہ لانے والے اس کو لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا۔ یہ گمان کرنا خدا پر بتان لگانا ہے کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، جو خدا اس باطل کے کی ہوئی قربانیوں کو بھی کاٹنا بنا تا ہو جو اس کا بنوٹا ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر کی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے، حالانکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ جو میرے دین کی مدد کرتا ہے میں اس کی مدد کرتا ہوں، اور قرآن نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا کی پارٹی ہریت نہیں اٹھاتی، وہ دشمن کے بالمقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اور مافوق اہل امانتیں اس کی پشت پناہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں، اور اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتے ہیں۔ سو یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے بررو اُعدہ کے میدانوں میں آئے تھے وہ یہاں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے بچا ہر جب چاہیں ان کو بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب غزوہ بدر کے موقع پر نزول ملا، لکھ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید خاص اور نصرت غیبی کا اظہار فرمایا تو ساتھ ہی اس ضمیر کو بھی رفق کر دیا کہ یہ نصرت خاص محض برحق تھی، اور ظہول کرنا یاد کرو، وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ، فتح و نصرت کی زمام اقتدار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح آج ہے، اگلے بھی رہے گی، اس لیے کبھی کسی زمانہ میں بھی، اہل ایمان کو اس تائید و نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یاس و قنوطیت اہل ایمان کے نہیں بلکہ اہل کفر کے خصائص میں سے ہے اور خدا کے ان وعدوں کو جن کا اور ذکر ہو چکا ہے، نیک اور نرود کی نگاہ سے دیکھنا اس گروہ میں شامل ہونا ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ لِيُظْهِرُوا لِلدِّينِ حَقَّهُ وَالْحَقُّ لِلَّهِ غَيْرَ مُتَّبِعِينَ (یہ لوگ خدا کے متعلق خلافت حق اور جاہلانہ گمان کرتے ہیں) ہر مسلمان کو اس گروہ میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اور اگر قرآن پر واقعی ایمان رکھنا ہے تو اس کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے وعدے بھولنے نہ چاہئیں کہ:-

جو خدا ترسی کی راہ چلتا ہے خدا اس کے ہر معاملہ میں سانی پیدا کر دیتا ہے

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات

اور نقصانات سے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق

پہنچاتے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی اللہ پر توکل رکھتا ہے اس کی کل مشکلات کے لیے اللہ کافی ہے۔

اور نقصانات سے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق

اور سب سے آخر میں یہ کہ:-

الَّذِينَ جَاهَدُوا فِيْنَا كَفَرًا يَهُمُّ سُبُلَنَا (عَنْكَرَات)

جو لوگ ہماری راہ میں سعی و جہد کرتے ہیں ہم ان پر پنی راہ میں ضرور کھول دیتے ہیں

ان حقیقتوں کے پیش نظر کسی صاحب فکر کا قیام دین کو ناممکن کتنا قلب و نظر کی بے بصیرتی اور اداسے فرض کی مشکلات سے بزدلانہ فرار کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، بالفرض اگر حالات حاضرہ عدم امکان کا سیلابی کو مستلزم ہیں تو پھر ذرا ان حالات کی نشاندہی کی جائے جن میں کامیابی کا امکان ہو۔ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے، اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر ماضی کے احوال و مناظر تو قوت حافظہ کی مدد سے پردہ حال پر لائے جاسکتے ہیں، ان احوال کو نگاہ تعمق سے دیکھیے اور پھر بتائیے کہ تاریخ انسانی کے اس پورے سلسلہ میں جو آدم سے شروع ہو کر آج ختم ہوتا ہے، قیام دین کے لیے جتنی کوششیں کی گئیں کیا ان سب کے زمانے اس جہد و جہد کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ کیا حضرت نوح کا زمانہ، جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی، یا حضرت ابراہیم کا زمانہ، جس میں نمرود کی خدائی قائم تھی، یا حضرت عیسیٰ کا زمانہ، جس میں ہر چار طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی، یا حضرت یحییٰ کا زمانہ، جبکہ یہودی شیطان ہر صدائے حق کا جواب قتل اور صلیب دیا کرتے تھے، یا پسمیر آخر الزماں کا زمانہ، جبکہ خود مرکز حق تین سو ساٹھ بتوں کا سکن اور جاہلیت کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا؟ یا مجدد اہل ثانی کا زمانہ، جب کہ "مسلمان" حکومت اسلام کے خلاف اپنا ساز و دست کر رہی تھی، یا سید احمد بریلوی کا زمانہ جب کہ اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار تھے، زمانہ حال کے مقابل میں نوازاں سازگار تھے؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر زمانہ قیام دین کے لیے اس کے کبھی زیادہ پر خطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا، جتنا آج ہے۔ پس اگر مشکلات و موانع کا لحاظ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک بھیدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جہد کے لیے سازگار تھا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناسازگار حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جان کی ناکامیاں اسی زمانہ کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے ادھر سو سو سال سے اس مقصد کے لیے کبھی براہ راست تگ و دو کی ہی نہیں تو آخر کس تجربہ کی بنا پر ناممکن ناممکن کا ہنگامہ بنا کیا جا رہا ہے؟ ہاں اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ طریقہ انبیاء کے مطابق یہ کوشش کرنی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں قطب و دلیل پیش کیا جاسکتا تھا مگر یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ آپ دریا میں اترتے نہیں اور دوسرے کھڑے کھڑے اس کی اتھاہ گرائی ناپ لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ آپ یقین فرمائیے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناسازگار اور کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک امکانات کے حصول میں ناکام رہے گی اور اس ذہنیت کے ماتحت کبھی بھی یہ جہد و جہد شروع نہیں کی جاسکتی، جس کفر سے آج وہ لڑتا ہے وہی کل بھی رہے گا خواہ اس کی شکلیں بدلتی رہیں، مگر قیام حق کے لیے ہر کفر کفر ہے وہ اپنے کسی دور اور کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا حق دار سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا اور نہ ٹھنڈے دل سے اپنے سامنے

اس کو پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جدوجہد کی جائے گی، کفر اپنے ہتھیاروں سے سٹح ہو کر سامنے آئے گا اور مختلف اشکال میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ہیں گی جن کا آج تصور کیا جاسکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ زاروں ہی سے ہو کر گذری ہے، اب یا آئندہ جب بھی گذرے گی انہی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہو کر گذرے گی، وہ اسکان اور سازگاری جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہ کے سازوں کو کبھی ٹی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شک و تردید کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا ہے اس نے بتا دیا ہے کہ ایمان کا ہر دعویٰ جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ عند اللہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک وہ اس بھٹی میں تپنے کے بعد اپنے کو کھرا ثابت کرے۔ حتیٰ کہ اگر بطور ایمان کی راہ صاف اور بے خطر نظر آ رہی ہو تو بھی قدرت اس ابتلا کے لیے ایسے حالات پیدا کر کے پہنچا ہے جن میں اس دعویٰ کی صداقت کا امتحان ہو جائے۔

اب یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جن ابتلاؤں اور ناسازگار یوں کو سنت اللہ ادا کے ایمان کے امتحان کے لیے ضروری قرار دیتی ہے آپ اس کا استقبال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینے کے بجائے ان سے دور بھاگ رہے ہیں اور انہی کو ان اپنے ادائے فرض کو ترک کرنے کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انگریزی فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے بند و قتل اور توپوں کے چھوٹنے کی دہشت ناک آوازیں آ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کٹورہ کر اس کا اولین سستی اپنے ہی کو یقین کرتا ہوا حالانکہ یہ حرکت ہی وہ آزمائش کا ہے جو اس تمنہ شجاعت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔

مفاوٹلی کابیت | اس سلسلہ میں ہمارے لیے سب سے زیادہ حیران کن جو شے ہے وہ "مفاوٹلی" کے نقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کو

كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَكُوْ
عَلَىٰ اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدِيْنَ وَالْاَقْرَبِيْنَ (نساء - ۵۸)

قسط پر (بہر حال میں) مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (حق کی) شہادت دینے والے بنو، اگرچہ اس قسط پر قائم رہنے اور اس شہادت (حق کی) زور خود تمہارے ہی اوپر یا تمہارے والدین یا اقرباء ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

کی تقسیم دی گئی تھی اور جس کے تعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰ مِنْ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ كَفَرًا الْجَنَّةَ (قرآ - ۱۲)

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اب اس کو اس امر کی یقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو اور خدا کی رضا جوئی کو دور چھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو! آخر فادامت کے نام پر اقامت دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے، اب وہ کوئی ایسا طریق کار

نہیں اختیار کر سکتے جس میں کھڑی کی سر بلندی اور مطالبات دین کی بجا آوری تو ہو مگر اپنے یا اپنی قوم کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں۔ اس کو چاہیے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، مفاد کو معاش پر، رشتائے الہی کو مفاد قومی پر، شہادت حق کو مفاد سیاسی پر، اقامت دین کو مصالحت ملی پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دے۔ العیاذ باللہ یہ ذہنیت ہے آج ہم مسلمانوں کی اور یہ انداز فکر ہے پیروان قرآن کا جس پر کفر اور مادیت بھی عیش عیش کر اٹھے۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور حاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

”کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے“ (تحریر صحیح)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جو کچھ نہیں لگ سکتا جس مفاد قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں۔ وہ ایک خطرناک بات ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانہ نبوت میں منافقین کا نقطہ نظریہ تھا اور ان کے نفاق کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ کھنٹی اَنْ تُصِيبَا دَاۤ اِسْرَۃَ ہِم کوڑے کرانگر ہم کھلم کھلا اور کیسہ ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تو ہم کو نصیبتیں گھیر لیں گی اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوت کا نشانہ بنیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کنایہ تھا کہ تمہارا تمہاری باتوں کی صحت و صداقت کا ہم انکار نہیں کرتے مگر:-

اِنْ تَتَّبِعِ الْاٰهْدٰى مَعَدَّۃً تَخٰطَفُ مِنْ اَرْضِنَا

اگر تم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایت الہی کی پیروی کر لیں تو فوراً اپنی اور وطن سے مار کر نکال باہر کر دیے جائیں گے۔ (قصص - ۶)

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے بارے میں جس طرز فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرز فکر و استدلال آج بھی مفاد قومی کے نعروں کے پیچھے کام نہیں کر رہا ہے؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبر صادق و صدق ہے، اتباع اسلام ہی ذریعہ نجات و فلاح ہے، لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے، ہم کو انڈیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا، اپنا مادر وطن کو انگریزی کے قبضہ میں رہنے دینگے! بے ارادان وطن کے اقتدار میں سے دیں گے اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس و سپانڈہ اور خدا جانے کیا کیا ہو جائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف امتد تائی کو ایسی جھلی ہوئی جھٹیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی زباؤں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفاد قومی کا بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ طرز عمل سراسر غلط اور ناکام ہے، اور حق کی فطرت بھی اسے ابا کرتی ہے۔ اب تک کی تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مقصد کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا ہے ان میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ تمدن یا غیر تمدن، آزاد یا غلام، دولت مند یا مفلس غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعی حق اور علم برودا قیام دین آیا اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ ”اے بندگان خدا! خدا کی بندگی اور طاعت سے اجتناب اختیار کرو تم تقصیر کے باوجود کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ کر کوئی دوسری پھیر دانی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے، پہلے اس حقیقت کو پوری سمجھو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہوا

اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریق کار کو ترک کرنا جائز کسی حجت شرعی
 کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہ انیسویں
 تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے، جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں اتنی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے اور یہی بیسویں صدی کا
 ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکساں اب تک کی پوری تاریخ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے
 ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا اور سب جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں
 میں مشترک رہتے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے مگر عوارض و ظواہر اور احوال و ظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ
 بھی ہوتے رہیں گے، اس لیے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے۔
 اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی مختلف تھا، اس لیے اگر اختلاف احوال کے
 باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی جو ہمارے زمانہ
 اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے، ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے
 کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج
 ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لیے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق یقین اور عین یقین کی حد تک
 پہنچا دے سکتی ہے اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء کو پھر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں
 نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الا نبیاء صلعم کے سامنے قریش نے پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنا لیتے
 ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی دعوت کو حید سے دست کش ہو جائیں، آپ سے ہماری صرف
 اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمائیے کہ آج کے اہل سیاست
 و تدبیر کے نقطہ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مستحسن موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیشکش کو قبول فرما کر ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں
 کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیروں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے، اور دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو کر حکمت و تدبیر
 اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزل مقصود کی طرف مارچ کرتے اور رفتہ
 رفتہ دین حق کو مملکت حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم نے اس "مستحسن" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا
 اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیے جائیں تو میں
 اپنی دعوت ہی اور اپنے طریق کار سے باز نہ آؤں گا۔ یہ کسی پرچش اور ماؤنہ الدماغ انقلابی فوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس
 مسلم حکمت اور رازدان حقیقت کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہ راست خدا کی
 نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے پیمان میں نہیں کہی۔ اس لیے ایک سو کن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پہنچنے
 دے گا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور اس طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصول مقصد کے لیے براہ راست
 جدوجہد سے زیادہ کمزور اور کارگر تھے، یا یہ کہ ان میں، نحوذالہ دور حاضر کے مدبروں اتنی بھی انجام دینی تھی اور یہ صلاحیت تھی
 کہ "احوال و ظروف زمانہ کے مطالبات و مقتضیات کا اندازہ کر سکتے اور وقت و ماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ نبیائے کرام کے اس اسوے اور متفقہ طریق کار کے جوئے ہم کو کس اسوہ اور لا محولہ عمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریہ میں بے بنیاد و عمول اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نابا کر پیش کیا جائے اور جس باطل میں آپ پڑے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایہ میں جا کھڑے ہوں کہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہوگا۔ جس کا رنگ و روغن تو دنیا ہوگا مگر فطرت بہر حال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس برا اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے زیادہ سازگار بنائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا سے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں، باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں حق کے جو پیرزاد آپ بہزار وقت لگائیں گے وہ آپ کے مقصد کے لیے خالص باطل اجزا سے زیادہ ہی مضر ثابت ہوگا۔

دور نہ جلیے اسی ہندوستان میں بہت سی اسلامی ریاستیں قائم ہیں جن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیس کے آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سردارہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں، مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت یسوع کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یاروں کیسے کہ اس وقت کے مسلمانوں ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گھاگھونٹ دیا۔ پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا، شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں کو انکو رہنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو بہت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر قدر و اہمیت معلوم کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ وضع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی تاسارہ گاہ سے گھرا کر مطالبہ کیا تھا کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو سہکائے آج ہیں، کل بھی رہیں اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں، آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پھر کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اقامت دین کے لیے کبھی براہ راست جدوجہد کی جائے۔

(باقی آئندہ)